

ہیں کہ انہیں سوئے ہضم کی بیشہ شکایت رہتی ہے..... پھلوں میں صرف کیلا کھا سکتی ہیں..... اناج میں آدمی روٹی..... وہ پیدائشی فقیر ہیں..... اپنے لئے نہ انہیں ریشم و کنواہ در کار ہے نہ آرام وہ پنگ بسرا..... اپنی ساری ضرورتیں انہوں نے سفر زندگی میں کیس بھگتا لی ہیں اور ان سے آزاد ہو گئی ہیں۔ لیکن جیسے ان مردہ خواہشوں سے بچوں کے لئے ان گنت خواہشات کا جاگ لگ گیا ہے۔ اب وہ دم بد مانگتی ہیں..... ہر لمحہ خوفزدہ رہتی ہیں اور جب یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تب وہ باور پی خانے میں ان چار بچوں کے لئے کھانے پکاتی ہیں۔

محمودہ جی کی زندگی شاب بھائی کی طرح سادہ نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سردیوں کی رات تھی سب ہمارے ماسٹر بیڈ روم میں جمع تھے۔ باتوں باتوں میں بچوں کی تربیت کا سوال اٹھا۔ شاب بھائی نے کہا..... ”میں نے سنائے کہ بھوپت، اینیخ خال اور صوفی انہیں خال موڑ سائکل مانتے تھے پھر تم نے لے کر کیوں نہ دیا اشفاق؟“

ہم تینوں بچوں کی تربیت بابا نور والے کے فرمودات کے مطابق کرنے کے آرزومند تھے۔ بقول ان کے بچوں کی خواہشات کا انتباخ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس طرح بچوں میں اناہدہ تھی ہے اور خود ان کے لئے مسئلے کا باعث نہیں ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ”ڈر لگتا تھا شاب بھائی۔ کہیں کوئی حادثہ وغیرہ“..... شاب بھائی مسکرائے اور بولے..... ” غالباً میرا سک تم سے کہیں زیادہ ہے۔ میرا فقط ایک بیٹا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس عمر میں موڑ سائکل تیز چلانے کا بھی بہت شوق ہوتا ہے لیکن ٹاقب کے شوق کے سامنے میری یہ احتیاط بے معنی ہے۔“ - شاب بھائی نے ٹاقب کو موڑ سائکل خرید دی۔ اس کے سامنے کے دو دانت بھی تیزی کے تجربے میں ٹوٹے پر وہ موڑ سائکل اس وقت تک چلا تاہباجب تک وہ خود اس کے سُم میں سے نہیں نکل گئی۔ شاب بھائی نے نہ موڑ سائکل چلانے پر پابندی لگائی نہ اس کی رفتار پر کوئی یکچھ دیا..... لیکن ہم فصلہ نہ کر کے اسی لئے اینیخ خال اور انہیں خال کو موڑ سائکل لے کر نہ دے سکے۔

ٹاقب کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب میں ریگل میں ڈاکٹر ڈاؤن کو کی فلم دیکھ رہی تھی اور ٹاقب اندر میں تھا۔ سکرین پر ایک چھوٹا سا لڑکا اپنی ماں کے تابوت کو دیکھ رہا تھا میری نظروں کے سامنے آنکھیں جھپکتا، پھر لی خاموشی کے ساتھ تکتا ایک آئندہ نورس کا لڑکا آگیا۔ وہ کس قدر شاب بھائی سے ملتا تھا۔ وہی ذہانت، شرارت بھری مکراہت، ازلی اداہی اور تنہائی۔ ایک بار ہیگ سے شاب بھائی نے مزار میں لکھا تھا۔

”اشفاق!

ہاتق خوب باتیں بتاتے ہے۔ اگلے خط میں اس کی تصویر بھیجوں گا۔ راہ چلتی ہر میم اسے گھورتی ہے پیار کرتی ہے گال کھینچتی ہے پھر کستی ہے۔

- What a sweet darling. Exactly looks like his father.
یہ کلمات سن کر عفت خارکھانی ہے لیکن اپنا دل پشاوری ہو جاتا ہے ۔

ظاہر لگتا تھا کہ شاب بھائی ہاتق سے بے نیاز ہیں۔ وہ اس کی آمد رفت، کھانے پینے، لباس پر نہ کوئی کمٹ کرتے تھے می مشورہ دیتے تھے لیکن مجھے یقین ہے اب، جب کہ وہ ہاتق کے پاس نہیں ہیں اب بھی وہ سلے بلوں کے ساتھ اور مندی مندی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ہیگ سے جب بھی خط آیا کہ ہاتق کا ذکر ضرور ہوتا۔ ایک خط میں لکھا تھا۔
”ہاتق بدستور بولنے میں ترقی کر رہا ہے اب انگریزی کے لفظ بھی بذریعہ ڈچ سیکھ رہا ہے۔ کوئی راہ چلتا آدمی بھی چینک مار بیٹھے تو متنانت سے کھڑا ہو کر کہتا ہے حمدوالله ۔
کوئی ذرا سی ٹھوکر کھائے یا اگر پڑے تو فوراً کہتا ہے بش ملا۔ یہ بچے بھی خدا نے عجیب شے بنائے ہیں انسان کو دونوں عالم سے بے نیاز کر دیتے ہیں ۔

سردی کے موسم میں ان کا ایک اور خط ملا لکھا تھا۔

”عفت مرغی کی طرح ہاتق اور مجھے پروں کے نیچے دبائے آرام سے بیٹھی ہے۔ اسلام اور شیر محمد بھی سروی کے مارے ڈربے میں دلکے ہوئے ہیں۔ ہاتق کے لئے پنڈی اور ہیگ، برابر ہیں۔ اپنی زبان بولتا ہے جب کسی کو انگریزی یا ڈچ بولتے نہیں ہے تو اس کے منہ کی طرف نکل دیکھ کر پوچھتا ہے ”اس کو کیا ہو گیا ہے؟“ اب روشنے بھی لگا ہے اور اگر نوش نہ لیا جائے تو اعلان کرتا ہے ”دیکھو میں گوچھے ہو گیا ہوں ۔“

۱۹۶۶ء میں خبر گرم تھی کہ شاب بھائی اب ہیگ سے واپس آنے والے ہیں۔ سفارت کے عمدے پر فائزیہ وفد انہوں نے بغیر کسی چیلنج کے گھر پر ہی گزارہ تھا۔ اس قیام میں انہیں ہاتق اور عفت کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اگست میں انہوں نے خان صاحب کو مکھا۔

”ہاتق پاکستان آنے کی خوشی منا رہا ہے اب بھی اس کا یہی خیال ہے کہ وہاں پر وہ نگاہ پھرا

کرے گا کیونکہ گرفتار ہوتی ہے۔ دھوپ والے دن یہاں کے ساحل سمندر پر جس انداز سے لوگ لیٹے رہتے ہیں، اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ دوسرے اس کا یہ ہے کہ سمندر پر نئے آدمی اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ ”کلکمار کر“ کیوں پہنچتے ہیں؟۔

ہیک میں ایمسڈری کے دوران عفت اور ٹاپ کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک اور راستے کو بھی خلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ فراغت کے لمحوں میں انہیں اپنے اندر چوری چوری کوہ تو رکھ لاش کر کے تراشے، چکانے اور جڑنے کا وقت مل گیا۔ ۳۱، رمی کو انہوں نے خان کو لکھا۔

یہاں آنے کے بعد دنیاداری کو غمہ دے کر اپنی روحانی تربیت میں لگا ہوا ہوں۔ نماز، روزے کا چکر روز افزوں ترقی پر ہے۔ تقلیل طعام، تقلیل منام اور تقلیل کلام پر شدید عمل جاری ہے۔ چنانچہ جب سے یہاں آیا ہوں اب تک ۱۹ اپونڈوزن کم ہو چکا ہے۔ تم تازہ تازہ دنبے کو ذبح کر کے ساڑھے نو یہ رچ بی نکالو اور اسے بڑے سے تسلی میں ڈال کر سامنے رکھو۔ پھر اندازہ کرو کہ ۱۹ اپونڈوزن کھٹکے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ نتیجے کے طور پر جسمانی، ذہنی، روحانی صحت کا احساس ہونے لگا۔ اس کے علاوہ یہاں آکر دوسرا تخفیہ ملا کہ گھر کی زندگی کی چاٹ کچھ یوں استوار ہو گئی کہ باہر کی ہر چیز فضول نظر آتی ہے۔ سارا وقت عفت اور ہاتھ کے ساتھ گزرتا ہے یہی محبت افضل نظر آتی۔ باقی سب فروعات ہیں۔ خدا کی شان ہے کہ لوگ یورپ آکر گھر سے بد کئے لگتے ہیں۔ لیکن راقم الحروف نے وطن سے نکل کر اپنا اصلی گھر دیکھا..... وغیرہ وغیرہ۔

یوں تو میں تاقب سے اس وقت ملی جب میں نے اسے ڈاکٹر ڈاؤکو کی فلم میں ایک کردار کی
غلل میں دیکھا لیکن کبھی کبھی وہ مجھے نظر آئے گا۔ ایک شام وہ پچھلے سی بلاک کے بازار میں ”اصلاح
گو“ سے بال کٹا کر آیا تو یکدم میں نے ویکھایہ چھوٹا سا سانوا لسلوٹا کر شن کنیخان صاحب کے سلپر
پہنچ ہوئے انیش خان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ پھر یہ دونوں اندر غسل خانے میں چلے گئے انیش خان نے
ہب کے بالوں میں شیپور لگایا اور اس کے بال سنک میں ایسے دھوئے کہ تاقب کی آنکھیں سرخی نظر
لائیں۔ کچھ دری بعد یہ دونوں بار مونیم بجائے میں مشغول تھا انیش خان بیٹھے گاہر ہے تھے۔ اور تاقب
نے جیوے پاکستان ”بجا فی کی مشق کر رہا تھا۔ ان بچوں کے توسط سے شاب بھائی کی جانب ایک
کوارٹر کھلا۔ پہلے جب عفت حیات تھی۔ بہم دونوں ان سب کی معصوم باتیں آپس میں کر کے خوش ہو لیتیں

تحصیں اور عام ماؤں کی طرح شیخیاں مار مار کر سمجھتی تھیں کہ ہمارے پچھے ساری دنیا سے زرا لے ہیں۔ غفرنے کے جانے کے بعد ایسی گفتگو یکدم ختم ہو گئی۔ کچھ سالوں بعد اسلام آباد میں اچانک مجھے ثاقب کا یہ اور روپ نظر آیا..... وہ انگریزی میں بڑی حساس نظمیں لکھنے لگا تھا۔ ان نظموں میں اندر وہی تجربات کی بالکل نئی پیشی گئی ہوئی تھی۔ میں یہ نظمیں کبھی کبھی خان صاحب اور شہاب بھائی کو سنانے لے جاتا اور چونکہ مجھے غلط وقت پر غلط بات کرنے کا بر امکہ حاصل ہے اس لئے جب یہ دونوں دوست سیاں گفتگو، شریعت اور طریقت کی باتوں کے مبتدھار میں ہوتے میں ثاقب کی کالپی کا صفحہ کھول کر کہتی ”شہاب بھائی آپ ثاقب کی نظم سنیں گے؟“

ANKS

lioness pats her cub
is silent, quiet
appy with life

the zebra's howl
is breath fading
is fine body flailing in the dust
A Thanks
his attacker
a carcass a Thanks to
vultures the ants, A
anks to
the skewed nature of this world

ld up your race
ld up your civilization
vittingly ceaselessly
essantly toiling
ainful Thanks
pay.

ank you Thank you
the loneliness
success
l the despair of defeat
ank you for the warmth
not knowing
ank you for the obscurity that
s within each of us
ank you for the oblivion
at surrounds us

Thanks for viciousness and pain
 Thanks for the stigma and shame
 Thank you for the Good Things
 And the Bad
 And the Things That Just Are

Say your Thanks and rest awhile
 For tomorrow you'll begin your Thank you's anew

SAQIB SHAHAB

BIRTH.

A drop falls
 On a still still pond
 Silently
 Shatters the world

A lion roars, somewhere
 Helpless, like man.
 Stillness
 Surrounds us

The child in the womb
 Hears the silence. And
 Is content
 His brother is quiet.

SAQIB SHAHAB

..... مارے لحاظ کے دونوں چپ ہو جاتے۔ ان کی باذی لینگوئر یعنی سے پتہ چلا گویا میں خل ہوئی۔ لیکن جوں جوں میں نظم پڑھتی شباب بھائی کا چروخی سے شابی ہوتا چلا جاتا وہ منہ سے تعریف کا جملہ کم کم بولتے لیکن ان کے روئیں روئیں سے تحسین اور واہ واہ کی خوشبو اٹھتی۔ شباب بھائی چند راتی سے ہاتھ تک پیاری ہی بیمار تھے۔ وہ جب بھی محبت کرتے خدا نہیں احساس ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہے لیے والے کی جھوٹی میں جگہ نہ رہتی لیکن وہ احساس نہ امت میں غلطان سمجھ کر حق ادا نہ ہو سکا۔ میراطریقہ یہ ہے کہ تحفہ دینے کے بعد اشارہ پوجھتی ہوں فرمائیے اس کا رنگ پسند آیا؟ خدمت کرنے کے بعد دوسرا سے کے شکریتی کی آس ہوتی ہے جو کچھ بھی میں کسی کے لئے کرتی ہوں ہمیشہ اسے رجڑ کرانے کی فکر میں رہتی ہوں شباب بھائی ہوا میں اڑنے والے پولن کی طرح بار آور کرتے۔ کہیں بیچ پڑھ گیا تو درخت بن گیا نہیں تو بخبر میں گرا اور تلف ہوا نہیں محبت میں لین دین سودو زیاد، احسان بے احسانی کچھ در کارنے تھا۔ وہ دلی کیفیت کو اشیاء کے حوالے سے نہیں جانتے تھے۔ محبت اس لئے کرتے کہ یہ ان کی اندر ونی کیفیت تھی اس کا محبت پانے والے پر کیا اثر ہوتا ہا اس سے انہیں غرض نہ تھی۔ شباب بھائی کی عادت تھی جب وہ ہمارے گھر دو چار روز تھر کر جاتے تو جمدادی سردار اس کے لئے پچاس یا سو اور باقی گھر کی دیکھ رکھ کرنے والوں کے لئے بھی ایسے ہی تاب سے کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے جب وہ مجھے یہ رقم پکڑاتے تو ایک ہی جملہ مکرا کر بولتے۔ ” یہ آپ کے Slaves کے لئے ہے ”

کبھی کبھی از راہ مذاق میں کھتی۔ ” اور شباب بھائی اگر میں یہ سبندوں اور خود رکھ لوں؟ تو؟ ” وہ بلکہ اس اشارہ ہاتھ سے کرتے اور چپ ہو جاتے۔ ان کا بس ایک ہی اصرار ہوا کرتا۔ کہ میں یہ رقم گھر کا کام کرنے والوں کو ان کی موجودگی میں نہ دوں۔

دینے دلانے کا سلسلہ بہت طویل تھا۔ کبھی ان کے گھر پر درجن بھر سلامی کی مشینیں دھری ہوتیں پوچھنے پر سب آئیں بائیں شائیں۔ اگر تحقیق کرتے تو پتہ چلتا مغلوک الحال کچھ عورتیں ہیں ان کے لئے خریدی ہیں۔ باونقدی سے جب بست بیمار ہوئیں اور شفا یاب ہو کر گھر لوئیں تو فون ہیدر روم سے بہت دور تھا۔ شباب بھائی نے کارڈیس، کچھ اس طریقے سے خرید کر دیا کہ شکریہ ادا کرنے کی نوٹ ہی نہیں آئی۔ مفتی جی، اشراق احمد، انشا جی اور جانے کوں کوں سے ایسے گھر تھے جدھر انہوں نے توجہ دی اور رزق، خوشی، اولاد، محبت اور جانے کیا کیا برکتوں سے گھروں کو یوں بھرا کہ دروازے بند کرنے مشکل ہو گئے۔ لیکن شاید اس ذکر سے ان کو ناخوش کرنے کا احتمال ہے اس لئے میں اس موضوع کو نہیں چھیڑتی۔ وہ لمبے لمبے القاب، بے جا شکریے، جھوٹی معدن تیں، الجھاد یعنی والے مناظرے، کسر نفسی کی گفتگو، تادبی کارروائی، قبیلی رویہ، سپاس ناموں کی زبان ناپسند کرتے تھے لیکن بر ملا انہوں

نے کبھی اس ناپسندیدگی کا انظمار بھی نہیں کیا۔

شہاب بھائی، ممتاز مفتی، انشابی اور اشراق احمد کا ایک حلقہ تھا۔ اس حلقے کے محیط پر جمیل الدین عالی تھے جو کبھی مرکز میں داخل ہو جاتے اور کبھی خط مہماں کی شکل میں دائرے کو چھو کر نکل جاتے۔ اس حلقے میں تمام خوبیاں گروہ کی تھیں لیکن ایک بات ایسی تھی جس کے باعث یہ گروہ کبھی سیاسی، ادبی اور معاشی دھڑے بندی کی طرح فعال نہ ہوا۔ یہ تمام قد آور شخصیتیں ارادے کی مضبوط تھیں اور اپنی اپنی سوچ رکھتی تھیں اور فرد کی طرح ایک ہو کر کسی نظریے پر کام نہ کر سکتی تھیں۔ اسی لئے نہ ان میں کوئی ماننے والا پسیدا ہوانے منوانے والا۔ انشابی کو کہ پہنچنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ کسی دوسرے کے کافی پر جوں نہیں ریتی اور وہ اکیلے ہی منسیبورتے پھوں کی منڈلی کو ساتھ لئے کوک پہنچنے چلے جاتے ہیں۔ مفتی جی اونچے اونچے کہہ رہے ہیں آج سے وہ نانجبار میرادوست نہیں۔ شام کو وہی شخص اشراق احمد کے گھر میں پیگز باندھے احرام کی کری پر راجحان ہے۔ یہاں سفارش نہیں چلتی تھی نظریے نہیں منوانے جاتے تھے۔ بس شہاب بھائی کی پھلوڑی تھی۔ زگس، جوہی، یا سین، گیندا بھائی اپنی اپنی خوشبو کے ساتھ زندہ تھے اور حال مسترد ہتھ تھنہ کی کوئی آنکہ چونکہ فلاں نے میری یہ بات نہیں بانی اس لئے اب سے میں قطع تعلق کرتا ہوں نہ اس بات کا احتمال ہی تھا کہ قطع تعلق کسی طور ہو بھی سکتا ہے۔ اختلافات کتنے بڑے کیوں نہ ہوں کوئی انیں سمجھانے کی کوشش نہ کرتا..... یہ شہاب بھائی کی برکت تھی۔ وہ لوگوں کو نئے سرے سے پہنچ کرنے کے شوقین نہ تھے بلکہ اللہ کے بنائے ہوئے سارے رنگوں سے مفاہمت کر لیتے تھے کی کو فیشن کے طور پر اپناتے نہ اختلاف کی وجہ سے چھوڑ دیتے۔

بڑے آدمی اور چھوٹے آدمی میں بیمادی طور پر یہی فرق ہے۔ بڑا انسان وہی ہوتا ہے جو دوسروں کے سارے تضاد اُن کی طبیعتوں کا فرق، حالات، خیالات سارے رنگوں کو خوش دلی سے قبول کرے۔ مسلک مختلف ہو تو اپنا مسلک چھوڑے بنا دوسرے کے اعتقادات کی تنظیم کرتا رہے۔ کچھ مختلف ہو تو اعتراضات کئے بغیر دوسرے کے کچھ کو بھی اچھا سمجھتا ہے رنگ، نسل، طبقات اور مجتمع، لباس، زبان غرضیکہ زیادہ سے زیادہ تضاد اور فرق کو زندگی کا حصہ اور انسان کو انسان سے ممیز کرنے کی سولت بھھ لے۔ ان امتیازات کی وجہ سے نفرت کا شکار نہ ہو۔

شہاب بھائی نہ تو پولیٹیکل لیڈر تھے، نہ رفاجر نہ واعظ۔ بڑے آدمی تھے بڑے سے بڑا فرق یہ کہجھ کر قبول کر لیتے کہ یہ بھی اللہ کا بنہ ہے اس لئے نکتہ چینی اس پر بھتی نہیں۔ انہیں کبھی کسی کو ٹوکنے، سزا دینے، جھوڑ کرنے تنبیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ ان کے نزدیک اختلاف، تضاد، فرق زندگی کا اصل اشیاء (Quite essence) تھا۔ ان کے نزدیک گوری لڑکی بھی پیاری تھی اور سیاہ سانوںی بھی..... شیعہ مسلک بھی قابل احرام تھا اور فر فرا گنگریزی بولنے والا ڈچ کلین شیو عیسائی بھی۔

وہ مسجد نبوی کے سامنے بیٹھی ہوئی سیاہ قام افریقی عورتوں میں بھی بڑے آرام سے بیٹھ کر اپنی چپلیوں کے بکل بند کرتے رہتے جس آرام اور سولت سے وہ پر یزیدیہ نہ ہاؤس میں کورس پر کورس کھانے میں مشغول ہوتے۔ بہت پڑھ لکھوں کی محفل ہو یا پڑھ ان پڑھ لوگوں کی وہ نہ کسی پربار گراں بننے کے کو کو گراں جانتے..... میں نے انہیں کبھی امیروں پر نکتہ جیمن نہ پایا، ہی کسی ڈھیلی کھاث پر بیٹھ کر سلوو کے کھوڑے میں پانی پینے ہوئے انہوں نے کسی غریب سے نفرت کی۔

رنگ سب چلتے تھے

زبانیں تمام درست تھیں

لباس بسکھی موزوں تھے

علاقوں تمام خوشگوار تھے

موسم تمام اچھے تھے

ذماہب سب اپنے اپنے پیرو کاروں کے لئے درست تھے۔

بس ایک بات پر وہ کبھی سمجھوئندہ کر سکے لیکن اس کا ذکر ان کی زبان سے اوائی ہے ہوا۔ ایک کوہ نور ہیر انہوں نے اتنے پر ووں میں چھپا کھا تھا کہ شاید ان کے قریب ترین دوستوں کو بھی علم نہ ہوا ہو کہ اس صحن میں نہ ڈکھ سکتے ہیں، نہ براشت کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ رسول اللہؐ کی ذات تھی۔ جانے وہ کیسے آؤں تھے کہ بولے بنا، اس نام کا ذکر کئے بغیر، کسی کے ساتھ اپنا جذبہ ڈسکس نہ کرتے ہوئے وہ ایک چارج سے بھرے رہتے تھے وہ لوگوں سے زیادہ ہاتھ نہ ملاتے بلکہ نہ ہر تر ادا کی وجہ شایدی ہی تھی کہ وہ جانتے تھے جس چارج سے وہ بھرے ہیں شاید اس کے لئے ہی عام آدمی شوٹ نہ کھا جائے۔ اور اس ارجی سے اسے نقصان پہنچ جوان سے ہر وقت نکلی رہتی تھی۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ ایک بلند والا شخصیت شاہ بھائی سے ملنے آئی۔ ان کا قیام سعودی عرب میں قائم کرمہ اور مسجد نبوی میں وہ بار بار گئے تھے اور کئی عمرے کر چکے تھے۔ ان کا عربی بس بدوجہ کھنکدار، گفتگو روان، آنکھیں جذبے سے پر اور قلبی واردات کا سلسلہ بغیر روک ٹوک جاری تھا۔ شاہ بھائی کے مہمان پر نہ ہی یو فور یا طاری تھا..... وہ بڑے جذبے کے ساتھ بار بار رسول اللہ کا نام، ان کی زیارت، خوابوں میں آنابڑی تفصیلوں سے بیان کر رہے تھے۔ شاہ بھائی موعد بیٹھے تھے لیکن ان کی ناک اور ہونتوں کے زاویے سے لگ رہا تھا گویا ساری گفتگو ان پر گراں گزر رہی ہے اب مجھ سے ایک فاش غلطی ہوئی۔ میں چونکہ بنیادی طور پر ڈرامانوںیں ہوں اس لئے مکالے میں میری جان ہے۔ جس وقت اس خوب و شخص نے مسجد نبوی میں اپنا ایک روحاںی تحریک بیان کیا تو میں نے بھی ڈائیلگ میں مارنہ کھانے کی غرض سے اپنا ایک خواب جھوٹ پچ ملا جلا کر زور بیان کی مدد سے سنا دیا۔

اس بیان کے دوران بھی بادل نخواستہ شاب بھائی چپ رہے نہ مجھے نوکانہ ہی روکانہ کسی وقت نہار افسکی کا انعام کیا۔ شام کو وہ اسلام آباد چلے گئے اور دوسری صبح مجھے ان کا فون آیا آواز میں نہ شدت تھی نہ سینہ نہ وہ نصیحت کر رہے تھے کہ جانے کا انداز تھا..... بس میری بستی خیر خواہی مقصود تھی کہنے لگے روحانیات، کشیفیات وغیرہ کی وارروات قلبی سراسر ذاتی تجربہ ہے اگر انہیں ظاہر کر کے ان کی تشریکی جائے تو یہ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اس لئے ان تجربات کو ہر کس وناکس پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی سے باطنی اور روحانی تعلیم و تربیت حاصل کی جا رہی ہے تو اُس سے کسی صورت چھپانا ٹھیک نہیں بھی یہ واردات تصوراتی ہوتی ہیں یا قوتِ مختیار کی کرشمہ سازی اور انسان خواہ نخواہ گراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ میرے لئے ان کی پہلی اور آخری سرزنش تھی۔

اس کے علاوہ شاب بھائی کا گروہ فرد افراد اور مجموعی طور پر اتنا بڑا تھا کہ میرے نمانے وجود کے لئے اس گروہ کا وجود ہی ایک بہت بڑی سرزنش تھی۔

ان بڑے لوگوں میں میرا وجود ن کے لئے کاستھ کا ساتھا..... بھی وزن شعیریں فٹنہ آتا تو نکتہ گردیتے بھی صورت اساتھ رہتا لیکن بلا یانہ جاتا۔ بھی سجاوٹ کے طور پر لکھ دیتے لیکن معنی ہوتے کہ پڑھانے جائے۔ سیدوارث شاہ کہتے ہیں۔

اہناء ہرنیاں دی عمر ہو بچکی جو پانی شیردی جوہ دا پینڈیاں نیں

میں بھی ایک ایسی اندھی ہرنی تھی جو بڑی مخصوصیت سے شیروں کے ساتھ سر کس میں کام کرتی تھی۔ بھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنے بڑے ادیبوں نے مجھے اپنے ساتھ لٹکائے پھر نے کاعزاز کیے دیا؟ گو میرا پچھے بھی لکھا ہوا یہ لوگ نہیں پڑھتے تھے لیکن بھی کبھی شباباں کے طور پر مفتی جی ضرور دل رکھتے اور تعریف کرتے شاب بھائی کو مجھے جیسے پنچھا قلی پر ترس آگیا جو برس ہابر سٹھنڈے کرے سے باہر بیٹھے کر پنچھا جھلتا رہتا ہے اور اندر رٹھنڈے میں لٹنے والے صاحب لوگوں کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ پنچھا قلی کو ہوا لگن تو درکنار چھت میں لگا ہوا بڑا پنچھا بھی نظر نہیں آتا..... پھر شاب بھائی نے اپنی Wishing سے میرے لئے راستہ نکالا اور ”راجہ گدھ“ کا چڑا ہونے لگا۔ بھی کبھی سوچتی ہوں کہ اگر یہ کتاب شاب بھائی کے علاوہ کسی اور کے نام معنوں ہوتی تو اس کا جانے کیا ہشر ہوتا؟۔

ہر انسان جب کسی دوسرے شخص کو جانتا ہے یا اس کے قریب ہوتا ہے تو اپنی ضرورت کے تحت فاصلہ کم کرتا ہے۔ میرے بیٹھا اسٹرخاں کی پیدائش کے سال بھر بعد سے لے کر عفت کی وفات تک کا عرصہ میں نے ایک خاص کیفیت میں گزارا۔ یہ بارہ تیرہ برس کا وقفہ راجہ گدھ کی جرسنیش کا عرصہ اور میری جلاوطنی کا عمدہ ہے۔ میں ایک کابوس کی گرفت میں رہتی تھی۔ دن اور رات مجھ پر

گزرتے نہیں تھے لزاں رہتے تھے۔ میں پتے پر بکھی ہوئی بارش کی بوند جیسی زندگی بس کرتی کچھ اپنے نم وجود پر پیشہاں کچھ پتے کی چکنی جلد سے ہر اس۔

مری طبیعت میں خوف اور حزن پیدائشی طور پر دلیلت ہے اسکے پر جو گردیں آف و بنیں ہے وہ مجھے شانتی اور آئندہ سے رہنے نہیں دیتا..... بدلتے موسموں کا خوف، لوگوں کی ناراضگی کا خدا شہ، بچی باتوں کے افشا کا ہر اس، پھرے دوستوں کی ازسرنو ملاقات کا ہول، حالیہ دوستوں سے پھر جانے کی دہشت، رشتہداروں کی تیوریوں کا ذر، اولاد کے مستقبل کا خدا شہ، شوہر کی ناراضگی کا کھلا..... یہاں سے وہاں تک خوف ہی خوف ہیں۔ جو دن بھر میں بھیں توبدل لیتے ہیں لیکن غالب نہیں ہوتے۔ جو آدمی طبی طور پر بزرگ ہو وہ کراشنس کے لمحات میں یا تو روتا ہے یا بھاگ جاتا ہے لیکن اگر ایسا شخص اویب ہو تو وہ کراشنس خوف اور حزن کی چلنی میں سے نکل کر تجزیے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آج تمام پاکستانی اپنے وطن کے حوالے سے خدشے اور ہر اس کا شکار ہیں اسی لئے گھر گھر تجزیے ہیں۔ کچھ لوگ معاشرتی اور معاشی نقصان نکال رہے ہیں۔ کچھ سوپر پاورز کے پیچے لٹھ لئے گھر تجزیے ہیں۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے سشم درست نہیں۔ کمی ذہین لوگ تعلیم کو دین گڑاتے ہیں۔ کچھ صاحب دل لوگوں کا خیال ہے کہ سیاسی خلاء نے یہ ابتر حالت بنا رکھی ہے..... شاید بہتیرے اندر ہی اندر سمجھتے ہیں کہ خوف اور اس سے پیدا ہونے والا حزن ہی تمام ابتری کی جڑ ہے۔ یہ خوف فرد اور قوموں کو مفلوج کرنے کو کافی ہے..... میں اس چھلکیڈی سے کے ساتھ پورے بارہ برس رہی ہوں..... مجھے معلوم ہے کہ بھئے کا چھلاو المباہونا چاہے تو آساناں تک دراز ہو سکتا ہے گھٹانا چاہے تو کالی مرچ بن کر گردن کی شرگ پر آبیٹھتا ہے۔ یہ سیامی بکری کی طرح لش لش کرتا ہیں آگے آگے بھاگتا ہے کہ بھی باڑھ کے باہر کبھی کمرے کے اندر گر کر پکڑا نہیں جاتا..... کبوتر کے پوئی کی طرح جاندار اور الوکی آنکھ ساہیشہ کھلا..... خوف کاذائقہ دل، زبان اور آنکھ میں ہمیشہ رہتا ہے..... اس کے ہاتھوں تنگ آ کر انسان خوشامدی، ڈرپوک، بزرگ، جھوٹا اور جھینپو ہو جاتا ہے..... خوف نہ صرف شخصیت کو کھا جاتا ہے..... بلکہ ایمان اور روح بھی اس کی زو میں رہ کر موسم زدہ لکڑی کی طرح کوکھلے ہو جاتے ہیں۔

خوفزدہ مال جب بچے پالتی ہے تو وہ انہیں اتارتک، ٹیپو سلطان، اور رضیہ سلطانہ نہیں بتا سکتی اسی طرح میں تے بھی جب اینق خان، انیس خان اور اشیر خان کو پالا تو ان کو درافت میں، تعلیم میں، گفتگو میں، رہن سکن میں وہاں مز کے ساتھ ساتھ جیج جیج وہ خوف بھی پالا شروع کیا جو میری طبیعت مانی تھی۔ میں ان تینوں کو لے کر کسی کے گھر مشکل سے جاتی کہ شاید یہ کوئی شرارت کریں اور صاحب خانہ کو ناگوار گزرے۔ میں انہیں ان کے دوستوں کے گھر بھی نہیں جانے دیتی تھی کہ مباداکل کلاں کوئی جواب دی کی صورت نکلے..... ہر قدم پر احتیاط..... ہر لحظہ گرانی..... روک نوک..... نصیحت جھڑی.....

کہتے ہیں جس گھر میں ایک بڑا آدمی ہو وہاں یونے پیدا ہوتے ہیں۔ چھترارے درخت تلے کی پنیری جب تک اکھاڑنے والی جائے مرجالی ہے یا یوں درخت پیدا کرتی ہے..... میرے تینوں بیٹے سعادت مند شریف اور ڈرے ہوئے بچے تھے کیونکہ وہ دونوں کے ذریمان رہ رہے تھے۔ جب کبھی مفتی جی ہمارے گھر آتے تو بند کمروں میں وہ میرے بچوں کے ہول نکالنے کا عمل کرتے لیکن مفتی جی اپنی تامتر اخساری کے باوجود خود قد آدم سے بڑے ہیں اس لئے تھوڑی دیر بچوں کے خوف کی ہوا خوری کرتے اور پھر اپنے نوگزے قدم سے اور بھی خوفزدہ کر کے چلے جاتے۔

میں آپ کو تباری تھی کہ شاید میرا خوف ملیٹانہ تعلق اور پیاروں کی بھی خواہی کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس معاملے میں غالباً تمام عورتیں اور خاص کر محمودہ جی بالکل میری طرح ہیں۔ ہم دونوں خیر خواہی، سلامتی، ترقی، فروغ کے حوالہ اور مفروضے اپنے پیاروں کے لئے ایک بار اندر بنا لیتی ہیں، وہ ہمیں شکوں کی طرح اڑائے پھرتے ہیں۔ شاب صاحب کی وجہ سے اور محمودہ جی کے باوجود شاقب، بلو، پیپل اور گذی تو نجع گئے لیکن میں نے اپنے بچوں کو جنم کھٹی بھی خوف کی دی..... گزتی بھی ہراس کی کھلائی۔ اور پسلا دو دھو بھی ڈر کی بکل تان کر پلا یا.....

عفت کی رخصتی کے بعد ایک شام اچانک بڑی زور کی آندھی چلی۔ ہمارے برآمدے میں جالی کے دروازے اور کھڑکیوں سے مٹی سے لدی ہوا آرہی تھی۔ کوٹھے پر سٹوڈیو کا دروازہ پٹاخ سے بند ہوا۔ پھر باہر سندھری کے درخت کی ڈالیاں زور زور سے جھوٹے لگیں..... ڈر انگر روم کی دو دروازہ نما کھڑکیاں کھلی تھیں ان کے آگے لگے پردے کمرے کے وسط تک آ کر اپنی مرضی سے پھر پھڑانے لگے..... غسل خانوں میں لوٹے بھاگے لان میں گملے اونڈھے ہوئے۔ پنکھوں کے سونچ بند تھے لیکن پنکھے آندھی پونی رفار کے ساتھ چل رہے تھے۔ پنکھوں سے چادریں اڑ کر کونوں میں روٹ ہو رہی تھیں..... اور گھر کے ملازم اور بچے شیشے کی کھڑکیاں دروازے بند کرنے میں مشغول تھے..... اینی خان کے غسل خانے کا دروازہ مسلسل بچ رہا تھا۔ جیسے آندھی میں میرا دل بجا تھے پچھے آنسوؤں کی دستک سے کچھ جانے جانے خوف کی آہت سے۔

پھر اچانک بتی چلی گئی..... سارا گھر آندھی اور نیم اندر ہیرے کی لپیٹ میں آگیا۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ میں نے پینٹری کی کھڑکی کارخ کیا عموماً ساں لا لیٹن دھری رہتی ہے کھڑکی سے باہر میں نے آسمان کی طرف دیکھا وہاں چھ سات روز کا چاند ملگبھی آندھی کے پیچھے دکھائی پڑتا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر آندھی چڑھی مٹی میں ایک ستارہ بھی ٹھیکارا تھا۔ اس ستارے کو دیکھ کر معاف مجھے خیال آیا کہ پہنچنے میں مجھے آس تھی کہ میں وہاں لوٹ جاؤں گی لیکن اب زمانے کی آندھیوں نے اسے بھی دھنڈ میں چھپا دیا اور لپیٹ جانے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ ساتھ والوں کے اپسی کا درخت جیتنی بھوت کی طرح

گول مٹوں بیل رہا تھا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلانی لیکن مجھے پتہ نہ چلا کہ لا لیثین کدھر سے اور کیسے کھلتی ہے؟ پھر مجھے لا لیثین سے ہی ڈر آنے لگا اگر یہ نہ کھلی اور اندر ہیرا بڑھتا گیا تو میرے بچے کیا کریں گے اس وقت جب میں اس اندریشے کے زیر اثر تھی اور لا لیثین کی ہر کلام روڑ کر دیکھ رہی تھی مجھے بھول چکا تھا کہ سارا گھر آوازوں سے بھرا ہے میں کسی کو بھی بلا کر لا لیثین جلانے کا حکم دے سکتی ہوں۔ لیکن آندھیاں، بارشیں، برفیں..... پت جھر میں گرتے پتے، گرمی میں کھلے ہوئے الماس کے پھول، ڈیوس روڈ پر لگے ہوئے فلم آف دی فارست کے درخت..... ان گنت چیزیں مجھ میں تبدیلی کا ہول جگاتی ہیں۔

جیسے کچھ ان ہونا ہو کر رہے گا.....

میرے خدا اور زندگی نے ہی شہ مجھ پر حرم کھایا۔ خود میں نے اور میری طبیعت نے ہی شہ اس رحم میں سیندھ لگائی۔

بڑی دیر لگا کہ ہزار بھتن سے لا لیثین جلا کر جب میں نے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھا تو آندھی چاند کو بھی کہیں اڑا کر لے گئی تھی اور صرف ستارہ رہ گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دعا کی کہ اے رب تو جانتا ہے کہ میں بے اصل اور کمزور ہوں..... میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس کے سارے کوئی مضبوطی سے پکڑ سکوں جو میرے خوف کے آگے ڈھال بن کر چلے..... تو مجھے کوئی ایسا وسیلہ دے جو میری ناطقی، ناطقی، ناطقی کا بوجھ اٹھا سکے..... جو باپ کی مانند میری ٹوٹی پھوٹی بات سمجھ سکے..... جو ہر غلطی، قصور، گناہ کے بعد باپ ہی کی طرح میری رعایت کر سکے..... چند ثانیے گزرے تھے کہ مجھے سلیپر دل کی آواز آئی پھر شاب بھائی نے ہوا سے بجھتے دروازے کو پکڑ کر پوچھا..... ”کوئی موم تھی ہو گی پانو؟.....“

وہ جانتے تھے کہ جس گھر میں کبھی کبھی بستی کی چادر، تو یہ ”غلاف، نمک، کالی مرچ نہیں مل سکتی وہاں دلوں سے موم تھی بھی ناگزی نہیں جا سکتی۔

” لا لیثین ہے شاب بھائی اور ایک نارچ ہے خان صاحب کی.....“

” لا لیثین ٹھیک ہے..... نارچ آپ رکھ لیں.....“

انہوں نے لا لیثین مجھ سے لی۔ اس کا ہوا کی وجہ سے شعلہ بھڑک رہا تھا اس کا ڈھکنا بند کیا جب روشنی کی لاث ساتھ ہوئی تو لا لیثین لے کر وہ برآمدے میں چلے گئے۔ پھر انہوں نے یہ لا لیثین کا سن کر میں لے جانے کے بجائے برآمدے میں رکھ دی سارا صحن نمبر آمدہ روشن ہو گیا میں کچھ دیر گودام میں، کمروں میں، فیوز باکس میں، لکھنے والی میزکی درازوں میں موم تھی تلاش کرتی رہی کچھ دیر کے بعد ایک موم بتانے مجھے مل گیا بناؤ نہیں خال نے بست ساری موم اکٹھی کر کے بنایا تھا۔ جب میں اسے جلا کر باہر پکچی تو شاب بھائی چپ چاپ برآمدے کی نفع پر بیٹھے تھے۔ بچوں نے باہر لان میں فوارہ چھوڑ رکھا تھا

آنہ می کی رفارم کم ہو گئی تھی اور اینق خان کے عسل خانے کا دروازہ اب شانتگی کے ساتھ کافی دیر کے بعد بجا تھا۔ میں شاب بھائی کے پاس بیٹھے گئی۔ کافی دیر ہم دونوں بچوں کو فوارے میں کھیلتا دیکھتے رہے۔

میں نے اپنی کسی کمزوری کا ذکر نہ کیا انہوں نے کرید کے ساتھ کچھ نہ پوچھا نہ میرے حالات زندگی نہ ہی میرے اندر رہنے والے وسو سے خوف اور ان کی نوعیت۔
بس اس روز ارشاد ہوا۔

”خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں، خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور دنیا ان سے دور بھاگتی ہے..... خواہش کو اپنے پیچھے بھینک دو..... اللہ پر بھروسہ کرو..... دنیا مثل سائے کے پیچھے پیچھے بھاگے گی..... منفی بات سوچیں گی تو منفی کا امکان بڑھے گا بثت سوچ ہو گی تو بثت و اعاثت کی قطار لگ جائے گی۔.....“

”شاب بھائی میرا دل بست ڈرتا ہے؟.....“

”کس لئے؟ یاد کھاؤں تو اللہ تعالیٰ کسی کا نقصان نہیں کرتے اور بفرض محال جس کو آپ نقصان سمجھیں ہو بھی جائے تو تلافی کے ہزار راستے ہیں..... اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔“
اس کے بعد انہوں نے مجھے کچھ پڑھنے کے لئے عطا کیا۔

”لیکن شاب بھائی میں ایسے وظیفے پڑھنے کی عادی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے حکم کی تعیین نہ کر سکوں۔ ایسی صورت میں آپ ہی کچھ دعا کرو یجھے.....“
انہوں نے دعا کا وعدہ کیا اور کاسنی کرے میں عشاء کی نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے۔ رفتار نہ انہیں نے ایک کن جوڑ، مجدد شکل اختیار کرنا شروع کی۔ چھوٹے چھوٹے پیر اگر اونکی شکل میں راج گدھ تشكیل پانے لگا۔ جوں جوں کتاب صخوں پر اترنی گئی، مجھ پر چھائے ہوئے خوف اور حزن کا بادل پڑھنے لگا۔ آندھیوں سے میں سائبائیں تلے آئیں۔ کرب کے ایک لمبے سفر کا اختتام ہوا۔

تب مجھے پتہ چلا کہ دعائیں تو بھی مانگتے ہیں اور بھی کی پوری ہوتی ہیں۔ لیکن شاب بھائی مجسم دعا تھے۔ وہ جس کے لئے دعا کر دیتے اس کا پیرا پار ہو جاتا۔ ان کی نظر میں آجاناہی خدا کے گھر کی ایک بڑی سفارش تھی۔

پھر یوں ہوا.....

میں ۸۲ء کے شروع میں بڑی بیمار ہو گئی اور مجھے خون کی کمی کے باعث ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ سیال و اصف علی و اصف صاحب دوسرا تیرے میری طبیعت کا پوچھنے آیا کرتے تھے ایک روز بے حد گرمی میں جب بہار گوچل رہی تھی و اصف صاحب مجھے ملنے آئے۔ اس وقت وہاں اجمل نیازی بھی

موجود تھے۔ اتنی گرمی میں موڑ سائکل جیسی سواری پر آتا اور عیادت کو خاموش تھکر سے ادا کرنا، اپنی توجہ کے کرباسے دوسرے کی تکلیف کو تینکے ساتھا واصف صاحب کا ہی کمال ہے۔

اجمل نیازی نے سوال کیا ”واصف صاحب یہ بتائیے کہ عبادت کی حقیقت کیا ہے؟“

وہ چند لمحے چپ رہے پھر بولے ”کچھ لوگ پیدائشی عبادت گزار ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی نزدیکی چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ عبادت کی استطاعت میں رکھتے انہیں صاحبان عبادت سے حصہ رکھنا چاہتے ہیں۔ مثلاً شاہب صاحب کو دیکھ لیتا ہی عبادت ہے۔ ایسے انان کے لئے جو عبادت کا مقدور نہ رکھتا ہو ان کو دیکھتے رہنا کافی ہے۔“

”میں آپ کی بات تکمیل طور پر نہیں سمجھا۔“

واصف صاحب بولے ”دکھنی ملک میں ایک ٹھیٹھیر ارتھاتھا۔ وہ بڑا مفلس تھا اور معمولی ظروف پیش، کافی اور دھرات کے بنا کر بیجا کرتا تھا۔ لیکن یہ ٹھیٹھیر ابڑا آرٹٹھ تھا۔ خالی اوقات میں اندر والی کو ٹھڑی میں بیٹھ کر ایسا خوبصورت ظرف بنایا کرتا جس پر خوبصورت نقش و نگار تھے۔ موقع اور فیروزے جزئے تھے۔ پندرہ سو لبرس میں یہ صراحی تیار ہوئی لیکن اس ٹھیٹھیرے کی دو کان چھوٹی تھی اور رو سا کا ادھر گزرنہ تھا۔ اس لئے اس خوبصورت ظرف کا کوئی خریدار نہ ملا۔

بالآخر ایک روز ٹھیٹھیرے نے سوچا کہ ایسا قیمتی برتن اس چھوٹی وو کان میں محفوظ نہیں اسے گھر لئے چلتا ہوں وہاں طاق میں رکھوں گا۔ شام کو اس کے پہلو میں دیار و شن کروں گا جب یہ جگہ گئے گاؤں صحن میں اس کے قیمتی پتھروں کی روشنی پھیلے گی۔ آنگن میں کھلینے والوں کے چہرے اس کی روشنی سے کچھ سیکھ جائیں گے۔ ٹھیٹھیرے نے ظرف کو بغل میں اٹھایا وو کان مقل کی اور بازار میں چلا آیا تاکہ گھر جائے اتفاق سے اسی وقت بادشاہ کی سواری ادھر سے گزری۔ بادشاہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک مفلوک اخال آدمی بغل میں ایک بے انتہا خوبصورت منقصش صراحی اٹھائے مودب کھڑا ہے سورج کی کرنیں جب ظرف پر پڑیں تو وہ ایسے جگہ گایا کہ بادشاہ ششد رہ گیا۔ ٹھیٹھیرے کو پاس بلا یا سواری سے اترتا۔ صاحب کمال کو ساتھ لیا اور ظرف کی منہ منگی قیمت ادا کی۔ تو شے خانے سے خلعت سواری اور پر گئے علیحدہ موصول ہوئے

تو یہ عبادت کی حقیقت ہے۔ اندر والے کمرے میں جو ظرف تیار کرتا ہے اور جب بہار لاتا ہے تو توفیق کی کرنیں اس پر پڑتے ہی بازیابی ہو جاتی ہے اسی بازار میں سینکڑوں اور بھی لوگ ہوں گے لیکن خالی ہاتھ کو نوازا نہیں جاتا۔ میں یہ نہیں کہتا کرم کے لئے کوئی اصول ہے لیکن جس کے ہاتھ میں منقصش ظرف ہو گا توفیق کی کرن پڑتے ہی وہ جگہ گئے گا اور سرفرازی ضرور ہوگی اس عمد میں یہ ظرف میں نے صرف شاہب صاحب کے پاس دیکھا ہے“

جتنی دیر میں ہستال رہی صاحبِ دعا کی توجہ مجھ پر رہی ڈاکٹروں کی محبت، اجنبی لوگوں کے خون کے علیے دور دراز سے دعائیں شعاعیں بن کر مجھ پر پڑتی رہیں۔ اسی بیماری کے دوران شاب بھائی نے میرے لئے دعلے نہ فیکون ”پڑھی۔ جب میں پوری طرح سے بوریا مستر باندھ کر اپنے ستارے کی طرف لوٹ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ صاحبِ دعلے خاموشی سے میرا راستہ روک لیا..... اور فطرت کو اپنا فیصلہ بدلتے پر مجبور کر دیا اس بیماری سے شفایا بہ ہو کر جب میں گھر پہنچی تو ایک بار پھر پریشان تھی۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر شاب بھائی سے خط میں کیا۔

خط میں ارشاد ہوا.....

”یہ جو آپ سمجھتی ہیں کہ موجودہ حملت شاید بیکار جائے کیونکہ ہستال والی کیفیت اور احساس اب گھر آکر دنیاواری کے زخمی میں باقی نہیں رہا۔ یہ درست نہیں جس طرح کوئی پھل جب ایک بار پک جائے تو اسے کسی طرح بھی واپس کچانہ کیا جاسکتا۔ البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی Sense of detachment کو رفتہ رفتہ بڑھاتے رہنا چاہئے۔ جسمانی محدودی توبیماری کے حملے نے عطا کر ہی دی ہے۔ اس لئے گھر کے جملہ کام کا ج سے ہاتھ اٹھانا آپ کا حق ہے زیادہ تر کام دوسروں پر چھوڑیں۔ ٹھیک ہوتے ہیں تو زیادہ خوش نہ ہوں۔ نہیں ٹھیک ہوتے تو ہر گز نہ کڑھیں۔ جس ڈھب پر یہ کام ہوں گے اسی ڈھب پر باقی سب کا life style خود بخود adjust ہوتا رہے گا۔ آپ اپنی توجہ زیادہ تر ذکر، فکر اور لکھنے پڑھنے میں لگائیں۔

اشفاق سے کہیں کہ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ قرآن آپ، کولادے۔ اے تھوڑا تھوڑا کر کے ہر روز پڑھیں ترجیح کے ساتھ۔ ایک بار ختم ہو جائے (خواہ کتنی دیر ہی کیوں نہ گے) تمہارا شروع کر دیں۔ قرآن کا پڑھنا پیار چھیلنے کے متراوف ہے۔ جتنی بار پڑھا جائے اتنی بار معنی کے چھکلے اترتے جاتے ہیں۔ معنی سمجھنے میں زیادہ تحقیق میں نہ پڑھیں۔ جتنا سمجھ میں آئے کافی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ سمجھ بھی وسیع اور گھری ہوتی جائے گی۔ البتہ یہ خیال رہے کہ جو literal معنی ہیں وہی بلاچون وچراں قبل یقین ہیں۔ اس شغل پر کچھ محنت صرف کی جائے تو detachment کی راہ خود بخود ہموار ہو جاتی ہے۔ اشفاق سے بھی کہیں کہ اپنی تہامت مصروفیات کے باوجود وہ بھی اس شغل کو تھوڑا تھوڑا اپنانے کی کوشش کرے.....“

میں نے جو کچھ شاب بھائی سے پوچھا ویسا ہی سوال شیما جمی徯 نے بھی کیا تھا کہ

کون اللہ کے فضل کا حقدار ہے یہ لاڑی کیسے نکلتی ہے؟ اس کے متعلق ایک بار شاہ بھائی نے
شیماجید کو بھی خط لکھا تھا۔

اسلام آباد

۱۸ دسمبر ۱۹۸۲ء

محترمہ عزیزہ شیماجید صاحبہ

آپ نے پوچھا ہے کہ جو علوم مخفی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتے ہیں، انسان کو ان کا
امیدوار کیسے رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ لاڑی کیسے نکالتا ہے؟ اور اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا
ہے؟

اللہ کے فضل کا حقدار تو کوئی نہیں کہلاتا۔ لیکن امیدوار سب کو اس طرح رہنا چاہئے
جس طرح لاڑی کا نکٹ لے کر یقین تو کسی کو نہیں ہوتا لیکن گمان سب کو رہتا ہے کہ شاید میرا
نبہری نکل آئے۔ لاڑی کی تشبیہ کو ذرا کھینچ کر بات حیرید صاف ہو جاتی ہے۔ لاڑی کا انعام
نکلنے کی امید اسی کو ہو سکتی ہے جس نے لاڑی کا نکٹ لیا ہو۔ جس نے نکٹ ہی نہ لیا ہو وہ اگر
انعام کی توقع لگا کر بیٹھ جائے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اللہ کے فضل کی لاڑی کا نکٹ اللہ کی
عبادت اور معرفت ہے جو لوگ یہ نکٹ حاصل کر لیتے ہیں ان کے فضل کو لاڑی کے انعام کی
امید لگانے کا حق پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل کی لاڑی کیسے نکالتا ہے اس کا علم تو فقط اسی کی ذات کو ہے۔
اس کا علم انسان کو کیسے ہوتا ہے، ہر ایک کو اپنی اپنی استعداد اور درجہ اور مقام کے مطابق
اپنے علوم کا پیانہ خود بخود اپنے آپ پر مکشف ہوتا رہتا ہے اس کے اپنے نور باطن سے ایسی
چیزیں اور باتیں معلوم اور محسوس ہونے لگتی ہیں جو نہ دوسروں کو معلوم اور محسوس ہوتی ہیں اور
نہ دوسرے عام ذرائع سے معلوم اور محسوس ہو سکتی ہیں۔ اگر کبھی ایسی کیفیت وارد ہو تو اسے
ہر کس و ناکس پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر کسی سے باطنی اور روحانی تعلیم و تربیت کا رشتہ
قام ہو تو اس سے ہر گز چھپانا نہیں چاہئے کیونکہ کبھی کبھی ایسی واردات تصوراتی ہوتی ہیں یا
متغیریہ کی کرشمہ سازی ہوتی ہیں اور انسان ائمیں نور باطن سمجھ کر گمراہی میں جتنا ہو جاتا
ہے.....

حقیر

قدرت اللہ شاہ

عبادت کے سلسلے میں بھی شہاب بھائی نے شیماجید کو خط لکھتے تھے۔

مری

۶، جون ۱۹۸۳ء

محترم عزیزہ شیماجید

عبادت بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے کی جائے اسی عبادت میں اصلی خلوص پیدا ہونے کی صلاحیت بد رجاء تم موجود ہوتی ہے اس کے علاوہ جو عبادت ذاتی، یاد نیا وی یاد یا دیگر مقاصد یا مرادوں کو پورا کرنے کی غرض سے کی جائے اس میں خلوص پورا نہیں ہوتا.....

حقیر
قدرت اللہ شہاب

پھر ایک اور خط میں اسی مضمون پر فرمایا

اسلام آباد

۲۳ ستمبر ۱۹۸۳ء

محترمہ عزیزہ شیماجید

اسلام علیکم

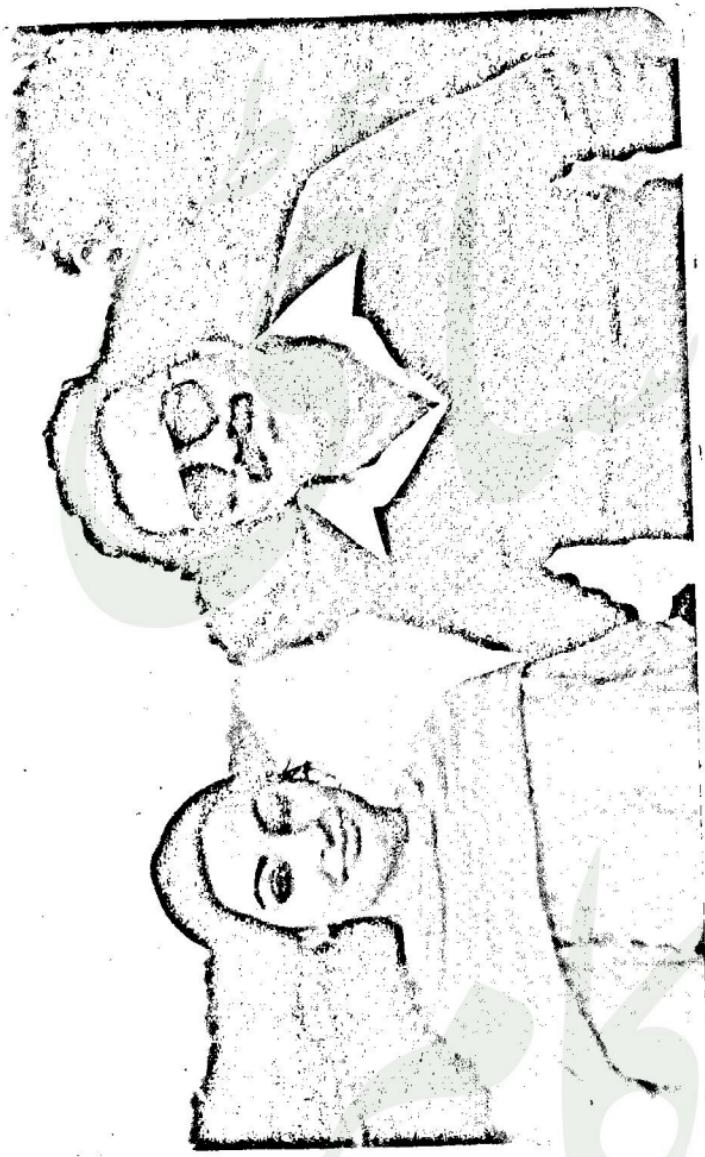
ڈاکٹر اجمل نے مولانا اشرف علی کے حوالے سے شخصی دعا کے متعلق جو لکھا ہے وہ میں نہیں پڑھا۔ البتہ شخصی دعا سے غالباً یہی مقصد ہو گا کہ انسان بر اہ راست اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خضوع و خشوع سے اپنی فریاد کرے، ایسا کرنے میں کسی خاص صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دروازہ ہر کس دنگس کے لئے یکساں کھلا ہے ہاں جو لوگ عام طور پر اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے کے خواگر ہیں لانہیں باری تعالیٰ کے ساتھ شخصی رابطہ استوار کرنے میں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی دوسروں کو کسی قدر پچھاہت محسوس ہوتی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے راستہ سب کے لئے کھلا ہے.....

داعا گو
قدرت اللہ شہاب

شہاب بھائی وار فنگلی کے آدمی نہیں تھے وہ جذبات کو عین معمول پر لانے کی کوشش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی خوبی ہی بعض اوقات اس کی خرابی، اور اس کی خرابی سی بیشتر نجات کا باعث بن جاتی ہے۔ کئی انسان گودنیا میں قابل تعریف شخصیت ہے لیکن یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ تنی کی بیٹی غلط راستے پر پڑی اور اس کا بیٹا مانگنے پر مجبور ہوا اور ذلت کی زندگی گزارنے لگا۔ چور اپنے اعمال کو دیکھ کر استغفار کی شیر ہی پر چڑھ گیا اور قطب کہلا یا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جس قدر اپنی کوتا ہیوں، خرا ہیوں پر پیشان ہونے کی ضرورت ہے اتنا ہی اپنی بھلی عادتوں، اپنی خصلتوں اور خوبیوں سے بچنے کی بھی ضرورت ہے۔ اپنی خوبی کا احساس کئی بار تکبر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور تکبر ایک ایسی آگ ہے جس میں اچھائی برائی سب بھرم ہو جاتی ہے۔ بس حیا اور عجز دو اچھے وصف ہیں یہ ساتھ ہوں تو نہ اچھائی تکبر بنتی ہے نہ برائی لے ڈوئی ہے اور ان کے اس وصف کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ اچھائی ہے کہ برائی۔

جب یہ چھوٹے تھے تو خان صاحب کے لئے لاہور کے قلعے سے ایک شخص مہاتما بدھ کا چھوٹا سا مجسمہ لایا، یہ مورتی صرف مہاتما کے سر کی تھی۔ میں نے یہ مجسمہ بچوں کے کمرے میں رکھ دیا۔ کبھی کبھی جب اینیخ خان گھری نیند سوایا ہوتا۔ تو مجھے نہم اندر ہیرے میں اس مجھتے اور اس کی صورت میں بڑی مشاہبت نظر آتی..... مجھے خوف رہنے لگا کہ راجہ گوپی چند کی طرح ایک دن میرا یہ بیٹا کمیں کسی بر گد تلنے جائیشے۔ آپ جانتے ہیں ہر عورت سوتن سے کہیں زیادہ چھپے ہوئے رب کی کشش سے ڈرتی ہے جو اس کے پیاروں کے کان پھڑوا کر ہاتھ میں کاسہ پکڑتا اور کانٹوں کا تاج پہناتا ہے ایسے میں ماں کے دل پر جو بیت جاتی ہے اس کا کسی ولی اور قطب کو گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی مشاہبت سے خوفزدہ ہو کر میں نے پہلے اینیخ کو میں کھلینے پر لگایا۔ پھر ہمار موسیم کے ساتھ گانے کے لئے ابھارا..... طبلہ سکھانے کے لئے ماسٹر لگایا اور بھانست بھانست کے مشغله اس کے ارو گرد بکھیر دیئے..... لیکن اینیخ کے چہرے پر پہلی ہوئی محبت بھری شانتی میں خوف کی کمی نہ آئی..... پھر وہ کچھ بیدا ہوا اور انگریزی میں نظمیں لکھنے لگا تو میں اور بھی خوفزدہ ہو گئی جب تک اندر راجہ گدھ لونہ چوتا ہوا دب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسے ادب کی پہنچی سے اتار کر سکرپٹ رائٹر بنانا چاہا لیکن وہ اپنے والدین کی شہرت دیکھ کر اور اس سے جنم لینے والے مسائل سے خوفزدہ ہو کر اس دشت کی پہنائی میں اترنا نہیں چاہتا تھا..... اینیخ خان ان دعوت ناموں کو پسند کر تا جو تو اتر سے ہمارے گھر آتے ان ایوارڈوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا جو ہمیں ملتے لیکن کمروں کی روشنیاں، بڑی بڑی محفلوں میں خود پسندی اور خود بڑائی کی باتیں، اپنے آپ کو تانٹا توپی سمجھ کر دوسروں کو گندی مکھی بنانے کافن، بڑی عمر کے سیلف میڈ آدمیوں کی فرعونیت اینیخ کو تاپند ہے۔“ اندر ہی اندر گمنامی، شانتی، خاموشی، دوسروں کے لئے بے شر رہنے کو پسند کرتا ہے۔ اسے بڑی محفليں، اوچھے بیان، بڑی عمر کے مرد ہت گڑ بڑا دیتے تھے.....

پھر ایک روز یوں ہوا



ائیق احمد خاں ایف سی کالج میں سائیکلوچی پڑھانے لگے۔ چونکہ ہمارے گھرانے میں تمام کام جوش، دلوں، اور درستی سے کرنے کا رواج ہے۔ اس لئے وہ بھی دنیا و دین چھوڑ کر صرف شاگردوں کی زبان سمجھتا تھا۔ ان دونوں طائف میں مقیم ایک سائیکلو جوست لاہور آئے ہوئے تھے۔ ان سے اینیق خاں ملتو معلوم ہوا کہ طائف میں قرآنی آیات کے ساتھ ذہنی بیماریوں کا علاج کیا جا رہا ہے اور اسی ضمن میں سائیکلی ایڈری کی ایک انوکھی برائیج دہان کھل گئی ہے۔ اینیق خاں بھی چمکتی آنکھیں اور لوٹہ انگین پلانوں کے ساتھ گھر لوٹے..... ان کا خیال تھا کہ وہ بھی طائف جائیں اور ذہنی بیماریوں کا علاج اسی طور پر کریں۔ شاب بھائی کرپ سول کے حوتے پسند میں مشغول تھے..... اینیق خاں کی بنا کی ہوئی چھتری ان کے پاس دھری تھی وہ بڑی توجہ سے بظاہر ان سے انداز میں اینیق خاں کی باتیں سنتے رہے۔ ایک بار بھی انہوں نے ان پر جوش باتوں پر ٹھٹھا چھیننا نہ مارا..... بالآخر اینیق خاں نے پوچھا.....

”شاب چچا کیا واقعی یے ممکن ہے؟ کیا قرآنی آیات سے علاج ہو جاتا ہے؟“

”ہاں کیوں نہیں..... بالکل ہو جاتا ہے۔“

”تو کیا میں طائف چلا جاؤں؟..... ایک بڑے مشن میں شاہل ہو جاؤں.....؟“

شاب بھائی بڑی دیر چپ رہے جیسے اپنے مشورے کی نیچر کو آنکر رہے ہوں پھر روئے.....

”میرا تو نیال ہے تمیں نہیں جانا چاہئے کیونکہ یہ قرآنی آیات کا صحیح استعمال نہیں۔ قرآن دراصل در دن کے سفر کے لئے ہے۔ دنیا بھی ساتھ ساتھ سورتی ہے۔ لیکن اسے کسی صورت بھی کمرشل و نیچر سے وابستہ نہیں ہونا چاہئے۔“

وہ جانتے تھے کہ عام انسان کا ایمان کمزور ہوتا ہے اگر کسی دن..... کسی وجہ سے کسی آیت سے علاج نہ ہو۔ کا تو یعنی ممکن ہے کمزور ایمان والے کا زیادہ ہی نقصان ہو جائے لیکن ڈھلی سی آواز میں بغیر اصرار کے شاب

بھائی نے جو مشورہ دیا اینیق خاں نے اس پر عمل کیا اور طائف نہ گئے۔

یوں تو میرے تینوں بنچے وقتاً فوتوٹا ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے لیکن کبھی بھی وہ بند کرے

میں شاب بھائی سے کچھ ڈھکی چھپی باتیں بھی کرنے جاتے جن کا سراغ ہمیں کبھی نہ ملتا..... شاب بھائی کے جانبے کے قریباً سال بھر بعد ایک دن اینیق خاں نے بتایا۔

”میری شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ غزل اور میں بالکل مختلف ماحول کی پیداوار ہیں۔ ہمارے خاندان اپنی پلچر ایک سے نہ تھے۔ اس کی سوچ اور میری سوچ میں بڑا ہی بعد تھا۔ اسی کلمہ میں ایک روز میں شاب

پچھا کے پاس گیا اور لجاجت سے عرض کی کہ یہ گاڑی مجھ سے تو چلتی نہیں آپ تماں کیا کریں۔“

..... ارشاد ہوا.....

”شادی کے چند ابتدائی سالوں میں Teething troubles ہوتی ہیں۔ وہ مختلف انسان ملنے ہیں۔“